اس مادہ " امن " سے فعل ثلاثی مجرّد (۱) أَمِنَ يَأْمَنُ أَمْنًا (باب سمع سے) بمعنی "امن میں ہونا ، امن پانا ، چین پانا ، خاطر جمع ہونا ، بے خوف ہونا " وغیرہ ہمیشہ لازم اور اور بغیر صلہ کے آتا ہے۔ اور (۲) أَمِنَ ..... يَأْمَنُ أَمْنًا (سمع سے ہی) بمعنی "........ سے بے فکر ہونا ' ...... کی طرف سے مطمئن ہونا ' .... سے بے خطر ہونا ' ...... سے امن میں رہنا " وغیرہ بطور فعل متعدی اور بغیر صلہ کے آتا ہے یعنی اس کا مفعول بنفسہٖ آتا ہے (أَمِنَهٗ) ۔ اور (۳) أَمِنَ ..... يَأْمَنُ أَمَانَةً (سمع سے ہی) بمعنی "...... پر اعتبار کرنا ' ...... کو امین بنانا ' ...... کے پاس امانت رکھنا " آتا ہے ۔ اس صورت میں بھی یہ متعدی اور بغیر صلہ کے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی " أَمِنَهٗ " ہی کہیں گے۔ (صرف مصدر میں فرق پڑتا ہے) ۔ البتہ جو چیز امانت رکھی جائے یا جس چیز کے بارے میں اعتبار کیا جائے اس سے پہلے " علی " کا صلہ آتا ہے۔ مثلاً کہیں گے " أَمِنَ زیدًا علی ...... (کذا) "۔ قرآن کریم میں یہ فعل ثلاثی مجرّد مذکورہ بالا تینوں معنی میں استعمال ہوا ہے اور فعل مجرّد سے ہی افعال اور اسماء مشتقہ کے چونسٹھ (۶۴) مختلف المعنی صیغے وارد ہوئے ہیں ۔ اس کے علاوہ باب اِفعال سے بکثرت اور باب افتعال سے ایک آدھ صیغہ آیا ہے ۔ ان کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا۔

جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہے لفظ " یؤمنون " بھی اس مادہ سے باب اِفعال کا صیغۂ مضارع ہے ۔ اس باب سے فعل آمَنَ ..... يُؤْمِنُ إِيمَانًا ۔ جب " با " (بِ) کے صلہ کے ساتھ آئے [یعنی آمَنَ بِہٖ .....] تو اس کے معنی : "..... پر ایمان لانا ' .... پر ایمان رکھنا ' ...... پر یقین کرنا یا لانا " ہوتے ہیں ۔ یعنی اس صورت میں عربی " با " (بِ) کا لفظی ترجمہ (...... کے ساتھ) کی بجائے اردو محاورہ کے مطابق (..... پر) سے کیا جاتا ہے [مگر عربی میں " آمَنَ علی ...." کہنا بالکل غلط ہے] ۔ لفظ " اِیمان " (جو اس فعل کا مصدر ہے) اپنے اصل عربی بلکہ اصطلاحی اسلامی معنی کے ساتھ اردو میں بھی بطور اصطلاح مستعمل ہے [1] عربی زبان کے متعدد کلمات اسی طرح

---

[1] البتہ اس لفظ کے معانی کی وسعت ، اہمیت اور اس کے تقاضوں کے (باقی اگلے صفحہ پر)

کسی اردو مصدر کے ساتھ ملا کر اپنے اصل عربی (لغوی) معنی میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً "ایمان" لانا ، "مطمئن" ہونا ، "اعتراف" کرنا وغیرہ۔ کیونکہ ان کلمات کے اصل عربی معنی اردو میں متعارف اور متداول ہیں۔

اس باب "اِفعَال" سے ہی یہ فعل "آمَنَ" ایک دوسرے صلہ "لام (لِ)" کے ساتھ (مثلاً آمنَ لَهُ) "سچ ماننا ، مطیع ہونا یا وزن دینا" کے معنی میں آتا ہے اور بغیر صلہ کے (یعنی آمَنَهُ) "امن دینا ، امان دینا" کے معنی میں بھی آتا ہے اور قرآن کریم میں بھی یہ مذکورہ بالا تینوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان کا ذکر بھی اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔

۲ : ۲ : ۱ (۲) [بِالْغَیْبِ] یہ دراصل بِ + الغَیْب ہے اور اس میں "با" (بِ) تو فعل "یُؤْمِنُون" کا صلہ ہے جس کے معنی ابھی اوپر بیان ہوئے ہیں۔ "الغیب" معرّف باللام ہے اور (اصل لفظ) "غیب" کا مادہ "غ ی ب" اور وزن "فَعْل" ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد غابَ یَغِیبُ غَیْباً (دراصل غَیَبَ یَغْیِبُ) باب ضرب سے بغیر صلہ کے تو ہمیشہ لازم آتا ہے اور اس کے معنی "پوشیدہ ہونا ، چھپا ہوا ہونا" ہوتے ہیں اور غابَ عن .... = ... سے پوشیدہ ہونا اور غابَ فی .... = ... میں چھپ جانا" کے معنی میں آتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ (غیب) سے فعل ثلاثی مجرّد کا کوئی صیغہ استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ افعال میں سے تو صرف باب افتعال کا ایک صیغہ ایک جگہ [الحجرات : ۱۲] آیا ہے۔ البتہ اس مادہ (غیب) سے بعض مصادر اور مشتقات قرآن کریم میں آئے ہیں۔ خود لفظ "غیب" ، مختلف تراکیب میں پچاس سے زیادہ دفعہ آیا ہے۔ "غَیب" دراصل تو مصدر ہے بمعنی "چھپنا"۔ مگر اکثر یہ اسم الفاعل (یعنی غائب) کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی "وہ جو انسانی حواس سے پوشیدہ ہے" یا جس کا علم حواس سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اردو میں یہ لفظ اپنے عربی معنی کے ساتھ مستعمل ہے

(تسلسل) بیان کے علاوہ دوسرے قریب المعنی الفاظ مثل اسلام ، تصدیق وغیرہ سے اس کے فرق کی وضاحت وغیرہ کے لئے مستند کتبِ تفسیر و عقائد کی طرف رجوع کرنا چاہیئے

اس لئے بیشتر مترجمین نے اس کا ترجمہ "غیب" ہی رہنے دیا ہے۔ جب کہ بعض حضرات نے اسے "بے دیکھی چیزوں" "چھپی ہوئی چیزوں" "بن دیکھی باتوں" یا صرف "بے دیکھے" سے ترجمہ کیا ہے۔ ان میں حواس سے مراد صرف آنکھ لینا (دیکھنا) بڑا محدود سا مفہوم بنتا ہے "چھپی ہوئی چیزوں" والا ترجمہ زیادہ بہتر ہے اور خود لفظ "غیب" ہی رہنے دینا بھی نہایت موزوں ہے۔ [مصدر کے اسم الفاعل یا اسم المفعول کے معنی میں استعمال ہونے پر کلمہ "ربّ" اور کلمہ "کتاب" کے ضمن میں بات ہو چکی ہے]۔

۲:۲:۱(۳) [وَيُقِيمُونَ] میں واو (وَ) تو عاطفہ (بمعنی اَور) ہے اور "يقيمون" کا مادہ "ق و م" اور وزن اصلی "يُفْعِلُونَ" ہے جس کی شکلِ اصلی "يُقْوِمُونَ" تھی۔ جسے اہلِ زبان بدل کر "يقيمون" بولتے ہیں۔ صرفیوں نے جب اس نوعیت کے بہت سے کلمات کی تبدیلیوں پر غور کیا تو انہیں اس میں ایک قاعدہ کارفرما نظر آیا اور وہ یہ کہ "اس (قسم کے الفاظ) میں واو کی کسرہ (ـِ) اس کے ساکن ماقبل یعنی "ق" کو دے دی جاتی ہے اور پھر خود "واو" کو اب اپنے سے ماقبل کی حرکت کے موافق حرف (ی) میں بدل دیتے ہیں۔ اسی کو صرفی تعلیل بھی کہتے ہیں۔ اس قاعدہ کا استعمال آپ سورۃ الفاتحہ میں "نستعین" اور "مستقیم" میں دیکھ چکے ہیں۔

اس مادہ (قوم) سے فعل ثلاثی مجرد قام يقوم قياماً (دراصل قَوَمَ يَقْوُمُ قِواماً) بابِ نصر سے آتا ہے اور اس کے کئی معنی ہوتے ہیں مثلاً "(۱) کھڑا ہونا، کھڑے رہنا (۲) اٹھ کھڑے ہونا (۳) رک جانا، ٹھہر جانا (۴) برپا ہونا (۵) واقع ہونا اور (۶) درست ہونا"۔ یہ فعل (قام یقوم) عموماً لازم اور بغیر صلہ کے آتا ہے۔ مختلف صلات [مثلاً قام بِ ......، قام لِ ......، قام الی ......، قام علی ......] کے ساتھ یہ مختلف معنوں کے لئے آتا ہے۔ اور یہ تمام استعمالات قرآن کریم میں آئے ہیں جن کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا۔

يؤمنون کی طرح "يُقِيمُونَ" بھی بابِ اِفعال سے فعل مضارع معروف کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے، جس کی اصل صورت اور تعلیل صرفی پر بات ابھی اوپر گزر چکی

ہے۔ باب افعال سے یہ فعل أقام ...... يُقِيمُ إِقَامَـةً [دراصل أَقْوَمَ يُقْوِمُ إِقْوَامًا] عموماً۔ بلکہ اکثر۔ متعدی اور بغیر صلہ کے آتا ہے۔ اس کے بنیادی معنی تو ہیں: "...... کو کھڑا کرنا ' ...... کو سیدھا کھڑا کرنا "۔ اور موقع استعمال کے لحاظ سے یہ متعدد معانی کے لئے آتا ہے۔ مثلاً (۱) ...... کو قائم رکھنا (۲) ...... کو برپا کرنا، ...... کو کھڑا کرنا (۳) ...... کو درست کرنا ' ...... کو ٹھیک حالت میں لانا ' (۴) ...... کو سیدھا کرنا ' ...... کا انتظام کرنا (۵) ...... کو اٹھانا یا اٹھا دینا (۶) ...... کو سیدھا رکھنا (۷) ...... کو درست رکھنا (۸) ...... کو قائم کرنا ' ...... کو نافذ کرنا۔ (۹) ...... کو برقرار رکھنا (۱۰) ...... کو سرانجام دینا (۱۱) ...... کو اس کا حق پورا پورا ادا کرنا (۱۲) ...... کو تمام شرائط کے ساتھ پورا کرنا۔ وغیرہ[1]

● بعض صلات (مثلاً بِ ، فی ، علی ، لِ) کے ساتھ یہ فعل بطور لازم کے بھی آتا ہے [جیسے أقام بالمکان = ... میں قیام کرنا یا ٹھہرنا۔ أقام علی الامرِ = ... پر قائم رہنا ' ...... میں لگے رہنا وغیرہ] ـــــ تاہم قرآن کریم میں یہ فعل (أقام) ان صلات کے ساتھ اور بطور فعل لازم کسی جگہ استعمال نہیں ہوا[2]۔

قرآن کریم میں اس باب (افعال) سے اس فعل (اِقامۃ) کے مختلف صیغے چوّن (۵۴) مقامات پر آئے ہیں۔ اور ہر جگہ متعدی اور اپنے مفعول کے ذکر کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ اس فعل کے اس متعدی استعمال کا تقاضا ہے کہ اردو میں ترجمہ کرتے وقت یا تو اس کے فاعل کے بعد " نے " آئے یا اس کے مفعول سے پہلے " کو " لگے۔ اور بعض جگہ " کو " کی جگہ " کا " زیادہ با محاورہ معلوم ہوتا ہے۔

فعل (اقام) کے بارے میں یہ نکتہ (فعل کا متعدی ہونا) ذہن میں رکھئے۔ آگے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے LANE کی "مدّ القاموس" یا راغب کی " المفردات " تحت مادہ " قوم "

[2] سوائے ایک جگہ (النحل : ۸۰) کے جہاں اس فعل کا مصدر " اقامۃ " بمعنی " قیام کرنا " یا " ٹھہرنا " آیا ہے اور دراصل وہاں بھی ایک مفعول فیہ مقدر ہے۔ یعنی فعل متعدی ہی ہے۔

چل کر اس فعل کے مختلف معنی سمجھنے میں یہ ممدّ ثابت ہوگا۔ اور بعض حضرات نے جو اس کا ترجمہ بطور "فعل لازم" کر ڈالا ہے اس کی غلطی بھی واضح ہو سکے گی۔

۲:۲ : ۱ (۴) [**الصَّلٰوۃ**] کا مادہ "ص ل و" اور وزن اصلی لام تعریف کے بغیر "فَعُلَۃٌ" بھی ہوسکتا ہے اور "فَعَلَۃٌ" بھی اور اس کی شکل اصلی "صَلُوَۃٌ" یا "صَلَوَۃٌ" تھی۔ دونوں صورتوں میں تعلیل صرفی [واو متحرکہ ماقبل مفتوح کا الف میں بدلنا] کے بعد وزن "فَعَاۃٌ" رہ جاتا ہے۔ اور لفظ کی شکل "صلاۃ" ہو جاتی ہے جس کی املاء (قرآن میں تو) عموماً "صلوۃ" ہوتی ہے۔

● اس مادہ (صلو) سے فعل ثلاثی مجرد "صلا یصلو صلوًا" (باب نصر سے) بمعنی ""صَلا" پر مارنا" ـــ اور صَلِیَ یَصْلٰی صَلاً (باب سمع سے اور دراصل صَلِوَ یَصْلَوُ بمعنی "صَلا" میں جھکاؤ پیدا ہونا یا اس کا ڈھیلا ہونا" آتا ہے[1]۔ تاہم نہ تو یہ فعل قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے اور نہ ہی اس کے معنی کا لفظ "صلوۃ" کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہے۔ (کھینچا تانی اور تکلف الگ بات ہے)۔ البتہ اس مادہ (صلو) کے باب تفعیل ـــ صلّٰی یُصلِّی۔ (دراصل صَلَّوَ یُصَلِّوُ) سے افعال اور بعض مشتقات کے پندرہ (۱۵) کے قریب صیغے آئے ہیں۔

● لفظ "صلوۃ" اسی فعل ـــ صلّی یصلّی بمعنی "نماز پڑھنا" کے مصدر کے طور پر استعمال ہوتا ہے یعنی صَلّی یصلّی صلوۃً کہتے ہیں۔ "تصلیۃً" نہیں کہتے۔ اس لئے کہ صلّی یصلّی تصلیۃً (واوی یعنی "صلو" سے) کے معنی تو ہیں "گھوڑے کا دوڑ

---

[1] اور "صلا" (جو دراصل "صَلَوٌ" ہے) اونٹنی یا گھوڑی ـ (یا گائے بھینس) ـ کے جسم کے اس حصے کو کہتے ہیں جہاں سے پیٹھ یا کمر کا حصہ نیچے کی طرف مڑتا ہے۔ یعنی دُم سے اوپر اور پیٹھ کے نیچے دونوں طرف کا حصہ۔ جو بچّہ کی پیدائش سے پہلے نیچے جھک جاتا ہے۔ بلکہ دُم سے اوپر دونوں جانب گڑھے سے نمودار ہو جاتے ہیں۔ "صلا" (پنجابی ڈھنگ) بلکہ دونوں "صلا" (صَلَوَانِ یعنی تثنیہ) کا یہ جھکاؤ جانوروں میں ان کے بچّے کی ولادت کے قرب (نزدیک ہونے) کی یقینی علامت ہوتی ہے۔

میں دوسرے نمبر پر آتا" جن کا لفظ " صلوۃ " سے کچھ تعلق نہیں۔ "کوملبس" بننے کی خواہش الگ بات ہے) اور یہ فعل اپنے ان معنوں کے ساتھ قرآن مجید میں کہیں استعمال بھی نہیں ہوا۔ اور صلّی یصلّی تصلیۃً (یائی — صلی سے) کے معنی " آگ میں جلانا " ہیں۔ اس کا یہ استعمال قرآن کریم میں بھی آیا ہے - اور اس پر اپنے موقع پر بات ہوگی۔

بعض حضرات نے اس لفظ (صلوٰۃ) کے بنیادی معنی توجّہ اور انعطاف یا " جھکاؤ " اور " میلان " لئے ہیں۔ اور بعض نے " صلوۃ " کی وجہ تسمیہ یا معنوی مناسبت یہ نکالی ہے کہ اس میں آدمی (بحالت رکوع وسجدہ) اپنی " صلا " (پیٹھ کے آخری حصے یعنی کمر) کو حرکت دیتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں معنی (خصوصاً پہلے معنی) کی فعل ثلاثی مجرد کے معنی کے ساتھ ایک مناسبت تو بنتی ہے تاہم اس لفظ (صلوۃ) کے معروف اصل معنی " دعا " کے ہیں۔ بلکہ بعض اہلِ علم نے اسی لئے لکھا ہے کہ " صلوۃ " بمعنی " دعا " اتنا مشہور ہے کہ اس کا اشتقاق کسی غیر معروف (اور قرآن میں غیر مستعمل) عجیب وغریب فعل سے تلاش کرنا یا ثابت کرنا " کارِ بے کاراں " ہے [2] اور اس کا فعل (صَلّیٰ یُصَلِّی صلوۃً) " علی " کے صلہ کے ساتھ تو بنیادی طور پر اپنے اندر " دعا " (خصوصاً دعائے رحمت وبرکت) کے ہی معنی رکھتا ہے۔ البتہ موقع استعمال کے لحاظ سے اس کا مناسب ترجمہ کر لیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ فعل کبھی اللہ عزوجل کی طرف منسوب ہوتا ہے کبھی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف، کبھی فرشتوں کی طرف اور کبھی اہلِ ایمان کی طرف — ان استعمالات پر اپنے موقع پر بات ہوگی۔

مندرجہ بالا بحث کا تعلق تو لفظ " صلوۃ " کے لغوی معانی سے تھا۔ تاہم یہ لفظ

---

[1] یہاں سے یہ نکتہ ذہن میں رکھ لیجئے کہ کسی " مادہ " سے مستعمل تمام افعال اور دیگر مشتقات میں ہمیشہ کسی بنیادی معنوی یکسانیت یا مشابہت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ اس کی متعدد مثالیں آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی۔

[2] روح المعانی ج ۱ ص ۱۱۶۔

دینِ اسلام میں ایک اصطلاحی معنی رکھتا ہے اور اس سے مراد " مسلمانوں کی معروف عبادت" ہے۔ جس کے لیئے ہمارے ہاں فارسی سے آنے والا لفظ " نماز " استعمال ہوتا ہے۔ جس کے اصل معنی چاہے کچھ ہوں لیکن بعض دوسری اسلامی اصطلاحات (خدا، فرشتہ، روزہ، دوزخ، بہشت وغیرہ) کی طرح اب یہ لفظ بھی اسلامی اصطلاح بن گیا ہے اور " صلوۃ " کے مترادف (IDENTICAL) ہو چکا ہے اور دنیائے اسلام کے مشرقی حصّوں میں یہ ایک جانا پہچانا لفظ ہے۔ اس لیئے اس کا استعمال اتنا غلط بھی نہیں ہے۔ البتہ اس کی بجائے لفظ " صلوۃ " کا استعمال بہتر ضرور ہے[1]۔

اپنے اصطلاحی معنی کے لحاظ سے لفظ " صلوۃ " ان الفاظ میں سے ہے جو دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام (صلّی اللہ علیہ وسلم) نے عربی زبان کو دیئے ہیں۔ اسلام سے پہلے یہ لفظ ان موجودہ (مسلمانوں کی معروف عبادت کے) معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے ۲۳ برس کے مسلسل عمل سے نہ صرف لفظ " الصلوۃ " کے معنی متعیّن کر دیئے بلکہ " اقامۃ الصلوۃ " [یقیمون الصلوۃ] کا پورا طریقہ اور اس کے ظاہری تقاضے (مسجد، اوقات، اذان، جماعت وغیرہ) سمجھانے کے علاوہ اس کے باطنی تقاضوں اور اس کی " روح " سے بھی کما حقہٗ آگاہ فرما دیا۔ خیال رہے کہ " صلّی یصلّی " (نماز پڑھنا یا ادا کرنا) اور " اَقَامَ الصَّلٰوۃ " (نماز قائم کرنا[2]) میں بڑا فرق ہے۔ " اقامۃ الصلوۃ " سے مراد " نماز کو

---

[1] یہ عجیب بات ہے کہ بعض حضرات " اللہ " کی بجائے تو " خدا " بلکہ " قانونِ خداوندی " جیسے عجمی الفاظ استعمال کرتے ہیں مگر انہوں نے " نماز " کو عجمی لفظ سمجھ کر اپنے " مفہومِ قرآن " سے یکسر خارج کر دیا ہے۔ اس کا بدل انہوں نے " اجتماعاتِ صلوۃ میں شرکت " اختیار کیا ہے مگر وہ بھی کچھ اس قسم کے ذومعنی یا مبہم انداز میں کہ چاہیں تو اس سے " باجماعت نماز " مراد لے لیں اور چاہیں تو کسی انجمن یا بزم یا جماعت وغیرہ کے " اجلاس " سمجھ لیں۔

[2] عربی میں مصدری معنی سمجھانے کے لئے مصدر کے علاوہ " ماضی مضارع " کے پہلے صیغے یا صرف ماضی کے پہلے صیغے سے کام لیتے ہیں۔

اس کی تمام شرائط اور تقاضوں کے ساتھ ادا کرنا اور اس میں بغیر کسی کمی بیشی کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طریقے کا اتباع کرنا" ہے۔ [لفظ "اقام" (تحت یقیمون) کے لغوی معانی پر بھی ایک دفعہ پھر نظر ڈال لیجئے]۔

ان ہی لغوی اور اصطلاحی معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو مترجمین قرآن نے اس حصہ آیت (یقیمون الصلوۃ) کا (مصدری) ترجمہ (۱) "نماز کو قائم رکھنا"، "نماز قائم رکھنا" (۲) "نماز کو درست کرنا" (۳) "نماز کو درست رکھنا" (۴) "نماز کو درستی سے ادا کرنا" (۵) "ادب کے ساتھ نماز پڑھنا" (۶) "نماز کی پابندی کرنا" کی صورت میں کیا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر "تفسیری تراجم" ہیں۔ بعض حضرات نے صرف (۷) "نماز پڑھنا بھی لے لیا ہے جو اتنا اچھا ترجمہ نہیں بنتا۔ باقی تمام ترجموں میں لفظ "اَقامَ" کے لغوی اور دینی تقاضے جھلکتے نظر آتے ہیں۔

[وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ] یہ دراصل وَ + من + ما + رزقنا + هم (یعنی پانچ کلمات) کا مجموعہ ہے۔ اس میں "وَ" تو عاطفہ بمعنی "اور" ہے۔ آخری "هم" ضمیر منصوب بمعنی "ان کو" ہے۔ کلمات "مما" اور "رزقنا" کی الگ الگ وضاحت کی جاتی ہے۔

۱:۲:۲ (۵) [مِمَّا] دراصل دو کلمات "مِنْ" (حرف جار بمعنی "میں سے") اور "مَا" (موصولہ بمعنی "جو کچھ کہ") پر مشتمل ہے۔ اس طرح اس کا لفظی ترجمہ ہو گا "اس میں سے جو کچھ کہ" ـــــ یہ دونوں کلمات یعنی "من" اور "ما" عربی زبان (اور قرآن کریم) میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کلمات کے لغوی استعمالات پر بات کر لی جائے تاکہ آئندہ ان کے معنی سمجھنا آسان ہو۔

ـــــ "مِنْ" مشہور حرف الجر ہے اور اس کا عام ترجمہ تو "....میں سے" یا صرف "......سے" ہی کیا جاتا ہے۔ تاہم مواقعِ استعمال کے لحاظ سے اس میں مختلف مفہوم پیدا ہوتے ہیں۔ معاجم (ڈکشنریوں) اور کتبِ نحو میں اس کے متعدد

معانی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اہم اور کثیر الاستعمال یہ ہیں:۔

(۱) ابتداء الغایہ کے لئے یعنی کسی جگہ یا وقت سے شروع کر کے آگے کسی وقت یا جگہ (تک) کے لئے۔ اسے "من ابتدائیہ" کہتے ہیں اور اس کا اردو ترجمہ "..... سے"، "..... سے لے کر"، "..... کی طرف سے" کی صورت میں کر سکتے ہیں۔

(۲) مجاوزۃ یعنی "آگے نکلنے" کا مفہوم ظاہر کرنے کیلئے جیسے کسی افعل التفضیل کے ساتھ۔ اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ تو "..... سے" ہی ہوگا مگر مفہوم "..... کی نسبت یا ..... کے مقابلے پر" کا ہوگا۔ اسے "من تفضیلیہ" کہہ سکتے ہیں۔

(۳) تبعیض کے لئے یعنی کسی چیز میں سے کچھ حصہ (بعض) کو ظاہر کرنے کے لئے اسے "مِنْ تبعیضیہ" کہتے ہیں اور اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ "..... میں سے کچھ" یا صرف "..... میں سے" بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۴) تبیین یا بیان کے لئے یعنی کسی ابہام (عدم وضاحت) کو دور کرنے کے لئے یا کسی چیز یا جنس وغیرہ کی وضاحت کے لئے۔ اسے "مِنْ بیانیہ" کہتے ہیں۔ اور اس کا اردو ترجمہ "..... کی قسم سے"، "از قسم ....." یا "..... از انجملہ" کی صورت میں کر سکتے ہیں۔

(۵) کسی عموم کی تنصیص (قطعیت) یا تاکید کے لئے۔ یہ عموماً کسی نفی یا استفہام یا نھی کے ساتھ آتا ہے اور اس کا مجرور ہمیشہ نکرہ ہوتا ہے جیسے "وما مِن الٰہٍ الا اللّٰہُ"۔ اس "مِن" کا اردو ترجمہ "کوئی بھی ....."، "کچھ بھی ....." سے کیا جاتا ہے۔

(۶) تعلیل کے لئے یعنی کسی کام کا سبب بتانے کے لئے اس صورت میں اس "مِنْ تعلیلیہ" کا اردو ترجمہ "..... کی وجہ سے"، "..... کے سبب سے" کیا جاتا ہے۔

(۷) بدل کے لئے یعنی کسی چیز کا عوض ظاہر کرنے کے لئے۔ تب اس کا اردو

ترجمہ "......کے بدلے"، "......کی بجائے" کیا جا سکتا ہے۔

(۸) اس کے علاوہ "مِن" کبھی کسی دوسرے حرفِ جار کی جگہ یعنی اس کے معنوں میں بھی استعمال ہو جاتا ہے خصوصاً "با" (بِ) بمعنی "کے ساتھ"، عَنْ بمعنی "......کے بارے میں"، فِی بمعنی "میں" یا "سے"، علیٰ بمعنی "کے مقابلے پر یا اوپر" اور عند (ظرف) "کے پاس۔ کے ہاں" کے معنوں میں آتا ہے۔

"مِن" کی یہ ممکن صورتیں یہاں اس لئے بیان کر دی گئی ہیں کہ آگے چل کر جہاں جہاں "مِنْ" آئے گا تو ہم یہ تبادیا کریں گے کہ یہاں "مِنْ" بیانیہ ہے یا تبعیضیہ ہے یا تخصیص و تاکید عموم کے لئے ہے یا فلاں حرف الجر کے معنی میں آیا ہے وغیرہ وغیرہ تاکہ آپ کو اس کے مطابق **اصل لفظی** اردو ترجمہ معلوم ہو جائے۔

۔۔۔۔ "**ما**" عربی زبان میں "مَا" کے معانی اور مواقع استعمال بھی متعدد ہیں۔ ان میں سے زیادہ عام اور بکثرت استعمال کی صورتیں حسب ذیل ہیں :۔

(۱) "**ما**" موصولہ : یعنی الذی کے معنوں میں مگر اس فرق کے ساتھ کہ یہ (مَا) زیادہ تر "غیر عاقل" چیزوں کے لئے آتا ہے اور مبنی بھی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ "جو کہ" ہے تاہم سیاقِ عبارت کے لحاظ سے "جسے" "جس کو" "جس کا" سے بھی ترجمہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ اس میں عموم (اور وسعت) کے معنی بھی ہوتے ہیں اس لئے بعض مترجمین اس کا ترجمہ "جو کچھ کہ" (بمعنی "جو کچھ بھی کہ") سے کیا ہے۔ اگرچہ بعض نے صرف "جو" سے بھی کام چلا لیا ہے۔

(۲) "ما" استفہامیہ : یعنی یہ اسم استفہام کے طور پر بھی آتا ہے اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ "کیا ؟"، "کون سی چیز" سے کیا جاتا ہے۔

کبھی اس کے ساتھ "ذا" لگا دیتے ہیں۔ "ماذا" کا ترجمہ عموماً "کیا کچھ" کرتے ہیں۔

(۳) "مَا" نافیہ : کسی فعل (ماضی) میں منفی معنی پیدا کرنے کے لئے شروع میں لگتا ہے۔

اس وقت اس کا ترجمہ " نہ " یا " نہیں " کیا جاتا ہے ۔

(۴) "ما" الحجازیہ یا " ما" مشابہۃ بِلَیْسَ : یہ عموماً جملہ اسمیہ کے شروع میں لگاتے ہیں جس سے خبر منصوب ہو جاتی ہے یا خبر پہ " بِ " لگا کر اسے مجرور بولتے ہیں ۔ چونکہ "لَیْسَ" بھی جملہ اسمیہ کے شروع میں آکر یہی عمل کرتا ہے ۔ اس لئے اسے " مشابہ بلیس" بھی کہتے ہیں ۔ اس سے نفی میں ایک زور پیدا ہوتا ہے ـــــ عربی گرامر کی عام کتابوں میں اسے بھی " ما نافیہ " لکھ دیتے ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ " ما نافیہ " وہ ہوتا ہے جو کسی فعل (ماضی یا مضارع) کے شروع میں لگ کر اس میں منفی کے معنی پیدا کرتا ہے ۔

(۵) " ما ظرفیہ جس میں عموماً وقت کا مفہوم موجود ہوتا ہے ۔ اردو میں اس کا ترجمہ "جب تک" " جتنی دیر تک " کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ "ما" کو تعجّب اور مصدر کے معنی پیدا کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔

" مَا " کے متعلق بھی یہ تفصیل یہاں اس لئے بیان کی گئی ہے کہ آئندہ جہاں جہاں لفظ " مَا " آئے گا ہم یہ بتا دیا کریں گے کہ (مثلاً) یہ ما موصولہ ہے یا استفہامیہ ہے یا حجازیہ ہے وغیرہ ۔ اس طرح آپ کو اس کا لفظی اردو ترجمہ معلوم کر لینے میں آسانی ہو گی ۔

یہاں آیت زیرِ مطالعہ میں "مِن " تبعیضیہ " اور " ما " موصولہ ہے ۔ اس لئے اس کا اصل ترجمہ (لفظی) تو ہو گا " اس میں سے جو کچھ بھی کہ ......"

۲ : ۲ : ۱ (۶) " رزقنا " کا مادہ " رزق " اور وزن " فَعَلْنَا " ہے ۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد رَزَقَ ..... یرزُق رِزقًا (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں (۱) ..... کو ..... عطا کرنا (۲) ..... کو ..... دینا (۳) ..... کو روزی دینا (۴) ..... کا شکر ادا کرنا ــــ یہ فعل ہمیشہ متعدّی اور بغیر صلہ کے آتا ہے ـــــ مقدم الذکر (پہلے) دو معنوں (دینا ۔ عطا کرنا) کی صورت میں اس کے لئے دو مفعول درکار ہوتے ہیں ۔ [جس کو دیا جائے اور جو چیز دی جائے] ۔ اور تیسرے اور چوتھے معنی کے لئے صرف ایک مفعول درکار ہوتا ہے ۔ قرآن کریم میں اس فعل کا استعمال زیادہ تر ایک مفعول کے ساتھ ہوا ہے ۔ یا مفعول کے ساتھ " مِنْ " یا " ما " کا استعمال زیادہ ہوا ہے جیسے یہاں

آیت زیرِ مطالعہ میں " مَا " آیا ہے ۔ ایسے موقع پر " ما موصولہ " کو " ما مصدریہ " کے معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے ۔ یعنی " مِمَّا رَزَقْنَا " بمعنی " مِنْ رِزْقِنَا " (ہماری عطاء سے) لیا جا سکتا ہے اور اسی کا بامحاورہ اردو ترجمہ " ہمارا دیا " ہے ۔ اور " مِمَّا رزقناھم " کا ترجمہ " ہماری دی ہوئی روزی میں سے " کرنے کی وجہ بھی یہی مصدری معنی کی بنا پر درست ہو سکتے ہیں ورنہ یہ ترجمہ لفظوں سے تو بہت دور ہے ۔

۲:۲ : ۱ (۷) [يُنْفِقُوْنَ] کا مادہ " ن ف ق " اور وزن " يُفْعِلُوْنَ "

ہے ۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد نَفَقَ ینفُق نَفاقًا (باب نصر سے) بمعنی (تجارت کا) رونق پانا آتا ہے اور نَفِق ینفَق نَفَقًا (باب سمع سے) بمعنی (رقم کا) ختم ہو جانا یا کم رہ جانا ۔ اور بعض دیگر معانی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ تاہم قرآن کریم میں اس سے فعل ثلاثی مجرّد کا کوئی صیغہ نہیں آیا ۔ البتہ اس (مادہ) سے مزید فیہ کے ابواب اِفعال اور مفاعلہ سے کچھ افعال اور بعض مشتقات بکثرت آئے ہیں ۔

" ینفقون " بابِ افعال سے فعل مضارع معروف کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے ۔ اِنفاق ۔ اَنفَق ..... یُنفِق اِنفاقًا کے معنی ہیں : ..... کو خرچ کرنا یا ..... کو خرچ کر ڈالنا ۔ ان معنوں کے لئے یہ فعل ہمیشہ متعدی اور بغیر صلہ کے آتا ہے ۔ اور قرآن کریم میں یہ فعل زیادہ تر ان ہی معنی کے لئے آیا ہے ——— عربی زبان میں یہ فعل بعض دفعہ " لازم " کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً اَنفَقَ الرّجلُ = خرچ کے لئے کچھ پاس نہ رہنا ——— بے زادِ راہ رہ جانا ۔ اَنفَقَ التاجرُ = گاہک زیادہ ہونا ۔ کاروبار بڑھنا ۔ تیزی میں آنا یا زیادہ بکری والا ہونا وغیرہ ——— تاہم قرآن کریم میں یہ فعل نہ تو بطورِ فعل لازم آیا ہے اور نہ ہی " خرچ کرنا " کے علاوہ کسی اور معنی میں استعمال ہوا ہے ۔

یہ تو اس لفظ (انفاق) کی لغوی بحث تھی ۔ تاہم ——— صلوۃ کی طرح ——— یہ لفظ اپنے ایک اسلامی اصطلاحی معنی بھی رکھتا ہے ۔ اس سے محض " خرچ کرنا " کی بجائے عموماً " انفاق فی سبیل اللّٰہ " (اللہ عزوجل کی راہ میں خرچ کرنا) مراد لیا جاتا ہے ۔

قرآن کریم میں کبھی تو اس مقصد کے لئے اس فعل کے ساتھ " فی سبیل اللّٰہ " یا " ابتغاء مرضات اللّٰہ یا " ابتغاء وجہ اللّٰہ " کے الفاظ مذکور ہوتے ہیں۔ اور کبھی ان قیود کے بغیر مطلقاً استعمال سے بھی معنیٔ مراد ہی ہوتے ہیں ۔ جیسے آیت زیرِ مطالعہ میں ہے ۔
قرآن کریم میں یہ فعل (اِنفاق) اور اس کے مشتقات کم از کم ستّر (۷۰) مقامات پر آئے ہیں اور اس کا استعمال لغوی اور اصطلاحی دونوں طرح ہوا ہے ۔ اور عموماً آیت کا سیاق و سباق یا بعض دفعہ کوئی قولِ ماثور معنیٔ مراد کی تعیین میں مدد دیتا ہے ۔ جیساکہ اپنے اپنے موقع پر واضح ہوگا ۔

۲ : ۲ : ۲ الاعراب

(الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلوۃ وممارزقنھم ینفقون ۝)
[الذین] کی بلحاظ اعراب یہاں تین صورتیں ممکن ہیں ۔ دو رفع کی اور ایک صورت جر کی بنتی ہے ۔ بعض نحویوں نے ایک چوتھی صورت (نصب) کے امکان کا بھی ذکر کیا ہے ۔ تفصیل یوں ہے :۔
(۱) اسے (اَلَّذِیۡنَ کو) اسم موصول مبتدأ — لھٰذا مرفوع سمجھا جائے ۔ یعنی " الّذین " اپنے صلہ (یُؤۡمِنون ..... سے ... یُوۡقِنُوۡنَ تک (آیت ۳، ۴) کے ساتھ مل کر مبتدأ ہو اور (اس صورت میں) آیت ۵ (اُولٰٓئِکَ علی ...... سے المفلحون تک) اس کی خبر سمجھی جائے ۔ اس صورت میں اردو ترجمہ : " وہ (لوگ) جوکہ ..... (آیت ۳ ، ۴ کا ترجمہ) .... ہیں " " وہ سب ..... (آیت ۵ کا ترجمہ) ..... ہیں / ہوں گے "۔
(۲) " اَلَّذِیۡنَ " کا صلہ صرف زیرِ مطالعہ آیت ۳ (یُؤۡمِنُوۡنَ ...... سے .... یُنۡفِقُوۡنَ تک) کو سمجھا جائے اور اس صلہ موصول (یعنی پوری آیت ۳) کو ایک محذوف مبتدأ کی خبر — لھٰذا مرفوع — مانا جائے یعنی بر تقدیر (ھم) اَلّذِیۡن ...... ینفقون تک — اس صورت میں اردو ترجمہ ہوگا : " (وہ) ایسے

لوگ ہیں جو .... ہیں" ـــــ اس صورت میں آیت ۳ کا ترجمہ الگ ہوگا۔ اگرچہ اس کا عطف آیت ۲ پر ہوگا یعنی ایک طرح وہ (آیت ۳) دوسری خبر ہوگی۔

(۳) "اَلَّذِیْنَ" کو اس کے صلہ (یؤمنون .... سے ..... ینفقون تک) سمیت سابقہ آیت (۲) کے "للمتقین" کی صفت یا اس کا بدل قرار دیا جائے۔ اور چونکہ موصوف یا مُبْدَل منہ ("المتقین") مجرور بالجر (لِ) ہے۔ لہٰذا صفت یا بدل ہونے کی بنا پر "اَلَّذِیْنَ" کو بھی مجرور سمجھا جائے گا۔ اس صورت میں بھی اردو ترجمہ "جو (کہ) .... ہیں" (تا اختتام آیت ۳) سے کیا جائے گا ـــــ اور یہ اعراب (یعنی "الذین ..... ینفقون" کو "المتقین" کی صفت یا بدل مجرور سمجھنا) زیادہ معقول اور موزوں اعراب ہے اور شاید اسی لئے اکثر مترجمین نے اس کا ترجمہ "جو" یا "جو کہ" سے کیا ہے۔ اگرچہ بعض نے اسے مرفوع (اوپر رفع کی دو صورتیں بیان ہوئی ہیں) سمجھتے ہوئے "وہ جو" سے بھی ترجمہ کیا ہے۔

(۴) بعض نحوی حضرات نے ایک چوتھی صورت (اعرابِ نصب کی) اضمارِ "اَعْنِیْ" یا تقدیرِ "اَعْنِیَ" (یعنی میں مراد لیتا ہوں یا میرا مطلب .. ہے/ "I mean to say") بیان کی ہے۔ اس طرح "الذین" فعل "اَعْنِیْ" کا مفعول بہ سمجھ کر منصوب قرار دیا جاسکتا ہے ـــــ بات یہ ہے کہ اسمائے مبنیہ کی صورت میں (جن کا اعراب ظاہر نہیں ہوتا) نحویوں کی عادت ہے کہ وہ اس میں رفع نصب جر تینوں اعراب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اوپر ہم نے "الَّذِین" کی رفع یا جر کے نسبتاً معقول اور قابلِ فہم اعراب بیان کر دیئے ہیں۔ نحوی حضرات کو نصب کے لئے اور کوئی وجہ نہ ملے تو اضمار "اَعْنِیْ" کا سہارا لیتے ہیں ـــ اضمار "اعنی" کے ساتھ نصب کی توجیہ بعض خاص مواقع کے لئے تو موزوں ہے۔ تاہم اسے ہر جگہ استعمال کرنا محض فنی یا ذہنی "بازیگری" ہے اور عموماً دور کی کوڑی لانے والی بات ہوتی ہے۔ جیسے یہاں اس آیت (زیرِ مطالعہ) میں۔

[یُؤْمِنُوْنَ] فعل مضارع معروف مع فاعل (ضمیر متصل "ھم")

جس کی علامت یہاں نَ سے ماقبل والی " واو " ہے ۔ یہ جملہ فعلیہ ہو کر " الَّذِیْنَ " کا صلہ ہے ۔ یا اگلی عبارت کی بنا پر، جو مل کر پورا " صلہ " بنتی ہے ۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس کے صلہ میں شامل ہے ۔

[بِالغَیْبِ] کے اعراب یعنی ترکیبِ نحوی کے لحاظ سے کئی صورتیں ممکن ہیں مثلاً : (۱) جار (بِ) اور مجرور (الغَیْبِ) مل کر فعل " یؤمنون " سے متعلق ہے ۔ یعنی اس میں فعل " یؤمنون " کی مزید وضاحت ہے ۔ گویا " کس چیز پر ایمان رکھتے ہیں " ؟ کا جواب ہے (۲) بعض نحوی حضرات نے " بالغیبِ " کو " حال کا قائم مقام سمجھ کر اسے محلاً منصوب قرار دیا ہے ۔ اس صورت میں " یؤمنون بالغیب " کا اردو ترجمہ ہوگا : " وہ (مومنوں سے) غائب ہوتے ہوئے (بھی) ایمان رکھتے ہیں " ۔ یعنی وہ منافق نہیں جو صرف مومنوں کے سامنے (پبلک میں) تو ایمان کا اقرار کرتے ہیں مگر ان کی غیر موجودگی میں یا ان سے پوشیدہ (پرائیویٹ حلقوں میں) ان کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے ——— اس توجیہ کو تفسیری نکتہ آفرینی تو کہا جا سکتا ہے ۔ تاہم یہ خواہ مخواہ کی اعرابی کھینچا تانی ضرور ہے ۔ (۳) اس کی ایک تیسری اعرابی صورت یہ ہے (اور یہ زیادہ واضح اور بہتر معلوم ہوتی ہے) کہ یہاں " با " (بِ) کو فعل " یؤمنون " کا صلہ سمجھا جائے ۔ اس طرح " بالغیب " مفعول بہ ہو کر محلاً منصوب ہوگا ——— یہ اس لئے بھی بہتر ہے کہ " تصدیق کرنا " یا " ایمان لانا " کے معنوں کے لئے فعل " آمَنَ یؤمن " کے ساتھ یہ " صلہ " (بِ) ضرور آتا ہے ۔ [دیکھئے اوپر " یُؤْمِنُون " کی لغوی بحث <u>۲ : ۲ : ۱ (۱)</u>]

[وَیُقِیْمُوْنَ] یہ بھی فعل مع فاعل (یُؤْمِنُوْنَ کی طرح) ہے اور [الصَّلٰوۃَ] اس کا مفعول بہ منصوب ہے جس میں علامتِ نصب " ۃ " کی فتحہ (ـَـ) ہے ——— اور یہ پورا جملہ " واو " (وَ) کے ذریعے اپنے سے پہلے جملے " یؤمنون بالغیب " پر عطف ہے (یعنی یہ جملہ معطوف ہے اور سابقہ جملہ معطوف علیہ ہے) ترجمہ میں دونوں فقرے " اور " سے ملا دیئے جاتے ہیں ۔ ترجمہ بحث " اللغہ " میں بیان ہو چکا ہے (دیکھئے اوپر <u>۲ : ۲ : ۱ (۳) و (۴)</u>) ۔

[وَ مِمَّا] اس میں " واو " تو عاطفہ (بمعنی اَور) ہے اور " مِمَّا " جارمجرور (من + ما) ہے ۔ " مَا " چونکہ اسم موصول مبنی ہے ، اس میں جرّ کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی ۔ اس " مَا " موصولہ کا صلہ [رزقنٰاھم] ہے جس میں " رزقنا " تو فعل ماضی معروف صیغہ تعظیم (جمع مذکر) ہے اور اس میں ضمیر فاعل "نحن" متّصل موجود ہے اور [ھم] اس فعل (رزقنا) کا مفعول بہ (ضمیر منصوب متصل) ہے ۔ اس میں " ما " (موصولہ) کی ضمیر عائد اور فعل (رزقنا) کا دوسرا مفعول بھی محذوف ہے بر تقدیر ۔ " رزقناھُمُوہُ "[1] یا " رَزَقْنٰاھُمْ اِیَّاہُ "[2] ۔

[یُنْفِقُوْنَ] فعل مضارع معروف (مع ضمیر فاعل مستتر "ھم") اپنے سے پہلے فعل " یُقِیْمُوْنَ " پر بذریعہ " واو " (جو مِمَّا سے پہلے ہے) عطف ہے ۔ اس عبارت (وَ مِمَّا رَزَقْنٰاھُمْ یُنْفِقُوْنَ) کی PARAPHRAZING یا سیدھی سادہ نثر ہوگی " وَ یُنْفِقُوْنَ مِمَّا رَزَقْنٰاھُمْ " ۔ گویا آیتِ زیرِ مطالعہ میں اَفعال کی ترتیب یوں ہے : " یُؤْمِنُوْنَ .... وَ یُقِیْمُوْنَ .... وَ یُنْفِقُوْنَ .... " مگر رُؤس الآی یا " فاصلہ " کی رعایت سے " ینفقون " کو آخر

---

[1] اگر منصوب ضمیروں " ھُمْ " یا " کُمْ " یا ضمیر مرفوع متصل (مثلاً قَتَلْتُمْ میں) کے بعد کوئی ضمیر منصوب آجائے تو اس " ھُمْ " ، " کُمْ " یا " تُمْ " کی "میم" کو (جسے اصطلاحاً میم الجمع کہتے ہیں) ضمہ (ـُ) دے کر اس کے بعد ایک واو لگاتے ہیں اس " مُ " کو " مُوْ " پڑھنے کے کچھ اور قواعد بھی ہیں مگر ان کا تعلق روایتِ حفص رح کے علاوہ بعض دوسری قراءات سے ہے جن کو ہم نے اپنے موضوع بحث میں شامل نہیں کیا (دیکھئے مقدمہ حکمت قرآن فروری ۸۹ء صـ ۲۰-۱۹) ۔

[2] ضمیر منفصل منصوب " اِیَّاہُ " کا یہ استعمال بھی ہم صرف محذوف ضمیر کی نحوی مثال سمجھانے کے لئے لائے ہیں اصولی طور پر یہ ضمیر فعل سے پہلے لاتے ہیں ۔ (دیکھئے بحث " ایاک نعبد " ۱:۴:۱)

پر لایا گیا ہے۔[1]

۲ : ۲ : ۳ الرسم

[الَّذِیْنَ] ھمزۃ الوصل کے اثبات اور لام واحدہ مشدّدہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ اور یہی اس کا رسم معتاد بھی ہے (دیکھئے سورۃ الفاتحہ میں بحث "الذین")

[یُؤْمِنُوْنَ] میں "یاء مضمومہ" کے بعد "و" لکھی جاتی ہے (یو) اور قراءتِ حفصؒ میں چونکہ اس "ی" کے بعد ھمزۃ (القطع) پڑھا جاتا ہے لھٰذا یہ "ھمزہ" "و" کے اوپر لکھا جاتا ہے (یؤ)۔ اصل رسم عثمانی میں ھمزہ کے لئے کوئی علامت نہیں ڈالی گئی تھی ـــ ھمزۃ القطع کے لئے اس وقت اسلامی ملکوں (کے مصاحف) میں جو مختلف علامات [ء ، ۶ ، E ، ● یا ٥ (زرد گول نقطہ) وغیرہ] مستعمل ہیں یہ سب دوسری صدی ہجری کے بعد کی ایجاد ہیں۔ "صَرفی" اعتبار سے "یُؤْ" کو "یُوْ" پڑھنا جائز ہے اور حفصؒ کے علاوہ بعض دوسری قراءات (مثلاً ورش یا ابوعمرو) میں اسے "یُوْ" ہی پڑھا جاتا ہے جسے ھمزہ کی تخفیف کہتے ہیں۔ [تاہم اختلافِ قراءات کی بنیاد روایت ہے۔ صرفی یا نحوی قیاس نہیں ہے] بہر حال قراءتوں کا یہ فرق اب علاماتِ ضبط کے ذریعے واضح کیا جاتا ہے اصل رسمِ عثمانی "یومنون" ہر صورت میں برقرار رہتا ہے۔

[بالغیب] میں "با" (بِ) کو ھمزۃ الوصل سے ملا کر لکھا جاتا ہے اور اس کی عام قیاسی املاء بھی یہی ہے۔ اسی طرح [ویقیمون] کی عثمانی اور

---

[1] الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے سادہ نثر میں یہ "شاعری" کا سا انداز اور اسلوبی جمال پیدا کر دینے کی بکثرت مثالیں آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی۔ شاید یہ بھی ایک وجہ تھی کفار کے آنحضرت (ص) کو "شاعر" کہنے کی۔ ورنہ ان کے لیڈر بھی یہ بات جانتے (اور مانتے) تھے کہ اصطلاحی اور فنی معنوں کے لحاظ سے قرآن اور "شعر" میں کوئی تعلق نہیں۔ یہ نکتہ ذہن میں رکھئے۔ آگے چل کر کفار کے اعتراضات کو سمجھنے میں مدد دے گا۔

قیاسی املاء (رسم) بھی ایک ہی ہے۔

[الصّلوٰة] یہ لفظ قرآن کریم میں (رسمِ عثمانی کے اتّباع میں) ہمیشہ اسی طرح "ل" کے بعد "و" اور آخر پر تائے مربوطہ (ۃ) کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ یہ "واو" دراصل "الف" کا کام دیتی ہے یعنی اسے پڑھا "صلاۃ" ہی جاتا ہے (اور عام عربی املاء میں تو اسے لکھا بھی اسی طرح "صلاۃ" ہی جاتا ہے)۔ قرآن کریم میں یہ لفظ معرف باللام شکل میں (الصلوۃ) پینسٹھ (۶۵) دفعہ اور اسم ظاہر کی طرف مضاف ہو کر دو دفعہ آیا ہے (صلوۃ الفجر اور صلوۃ العشاء — النور: ۵۸) ان تمام مقامات پر یہ اسی طرح "صلوۃ" (الف بصورت واو کے ساتھ) لکھا جاتا ہے۔ البتہ اگر یہ لفظ کسی ضمیر کی طرف مضاف ہو (اور اس طرح بھی یہ لفظ قرآن کریم میں گیارہ (۱۱) دفعہ آیا ہے) تو اس وقت یہ اکثر "واو" کی بجائے "الف" سے ہی لکھا جاتا ہے مثلاً "صلاتی"، "صلاتھم"، "صلاتہ" وغیرہ۔ لیکن ان مضاف (الی ضمیر) ہو کر آنے والے (گیارہ) مواقع میں سے بھی بعض جگہ مقرر جگہوں پر اسے "واو" کے ساتھ (صلوۃ) ہی لکھتے ہیں۔ ان مقامات کا بیان اپنی اپنی جگہ پر آئے گا۔

البتہ لفظ "صلوۃ" میں یہ "واو" اس بات کی علامت کے طور پر لکھی گئی تاکہ معلوم رہے کہ اس لفظ کا اصل مادہ "ص ل و" ہی ہے۔ صرفی تعلیل — یا اہلِ عرب کے نطق — کے مطابق یہ "واو" (اور ناقص یائی کی "یا" بھی) الف میں بدل جاتی ہے تاہم اس کا قرآنی رسم الخط "صلوۃ" ہی رہتا ہے۔ اس طرح کے سات اور الفاظ "الزکوٰۃ، الحیوٰۃ، الربٰوا، الغدوۃ، مِشکوٰۃ، النجوٰۃ اور مَنوٰۃ" بھی ہیں۔ (ان سب میں "واو" کو "الف" پڑھا جاتا ہے)۔ اور ان سب کی املاء (بمطابق رسم عثمانی) میں مندرجہ بالا اصول [یعنی صرف کسی ضمیر کی طرف مضاف ہوتے وقت الف کے ساتھ ورنہ باقی صورتوں میں "واو" کے ساتھ لکھنا] مدّنظر رکھا جاتا ہے[1]۔ ان کا بیان اپنے اپنے موقع پر آئے گا۔

---

[1] اگرچہ ان میں سے بعض کلمات قرآن کریم میں کہیں بھی کسی ضمیر کی طرف مضاف (باقی اگلے صفحہ پر)

[وَمِمَّا] یہ بیان ہو چکا ہے کہ یہ لفظ (مِمَّا) دراصل مِنْ ما [یعنی مِنْ جارّہ اور مَا موصولہ کا مرکب] ہے ۔ یہ لفظ قرآن کریم میں قریباً ایک سو پندرہ (۱۱۵) دفعہ آیا ہے اور ہر جگہ اسی طرح ملا کر (موصول) لکھا جاتا ہے ۔ ماسوائے تین مواقع کے (النساء : ۲۵ ، الروم : ۲۸ ، المنافقون : ۱۰)۔ پھر ان تین مواقع میں سے بھی دو جگہ تو یہ بالاتفاق الگ الگ (مقطوع یا مفصول) یعنی بصورت " مِنْ مَا " لکھا جاتا ہے اور ایک جگہ (المنافقون : ۱۰) کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہاں اسے مقطوع لکھنا ہے یا موصول[1]۔ ہر ایک کا بیان اپنی اپنی جگہ پر آئے گا ۔

[رَزَقْنٰھُمْ] جو دراصل " رزقنا + ھم " ہے ۔ [اور عام عربی املاء (رسم قیاسی) میں اسی طرح (رزقناھم) لکھا جاتا ہے] ۔ مگر قرآن کریم میں " ن " کے بعد والا " الف " لکھنے میں حذف کر دیا جاتا ہے (پڑھا ضرور جاتا ہے)۔ اور اسے " ھم " کے ساتھ ملا کر لکھا جاتا ہے ۔ بلکہ قرآن کریم میں تو ضمیر متصل فاعل جمع متکلم (.... نَا) عموماً ہر جگہ [جیسے خَلَقْنَا ، عَذَّبْنَا ، اَھْلَکْنَا وغیرہ میں] عموماً ہر جگہ اسی طرح بحذفِ الف (بعد النون) اور مابعد کے ساتھ موصول یعنی ملا کر (نٰ ....) لکھی جاتی ہے جب کہ بعد میں ساتھ کوئی ضمیر منصوب آ رہی ہو ۔ اسم ظاہر (منصوب مفعول) کے ساتھ اسے باثبات الف ہی لکھا جاتا ہے ــــ اس قسم کے کلمات [ضمیر متصل فاعل جمع متکلم کے ساتھ ضمیر منصوب ملا کر لکھنا] کی کتابت رسم عثمانی کی خصوصیت ہے ۔ عام عربی قواعدِ املاء کی رُو سے ایسا (مثلاً خلقنٰہ) لکھنا درست نہیں ۔ مگر قرآن کریم کی کتابت میں اس کی خلاف ورزی ممنوع ہے ۔ یعنی " خلقنا ہ " لکھنا

(تسلسل) ہو کر نہیں آئے ۔ اس قسم کے کلماتِ قرآنی کے رسمِ عثمانی کے مطابق املاء کے بارے میں مزید وضاحت کے لئے دیکھئے المقنع ص ۵۴ ببعد ، العقیلہ ص ۸۰ ببعد ، دلیل الحیران ص ۲۸۱ ببعد ، نثر المرجان ج ۱ ص ۶۸ ببعد اور سیر الطالبین ص ۸۷ ببعد ۔

[1] مزید بحث کے لئے دیکھئے نثر المرجان ج ۱ ص ۸۰ ، لطائف البیان ج ۲ ص ۵۹ ، العقیلہ ص ۸۷ ، المقنع ص ۶۹ سیر الطالبین ص ۹۲ ۔

غلط ہو گا۔

[يُنفِقُوْنَ] کی املاء عام قیاسی املاء کے مطابق ہے۔

۲:۲:۴ الضبط

(الذين يومنون بالغيب ويقيمون الصلوٰة ومما رزقنٰهم ينفقون)

آیت زیرِ مطالعہ میں اختلافِ ضبط کے حسب ذیل مواقع موجود ہیں :-

(۱) همزة الوصل کی علامت (صلہ) ڈالنا یا نہ ڈالنا اور ڈالنے کی صورت میں اس کی صورت (صہ ، ●) کا اختلاف۔ اس اختلاف کا اثر کلمات " الذین " ، "بالغیب " اور " الصلوٰۃ " کے ضبط میں ظاہر ہو گا۔

(۲) همزة القطع کی علامت ڈالنا یا نہ ڈالنا اور ڈالنے کی صورت میں اس کی شکل (ءَ ، ء ، ۶ یا ٥) کا اختلاف۔ اس کا اثر کلمہ " یومنون " کے ضبط میں ظاہر ہو گا۔

(۳) واو ساکنہ ماقبل مضموم پر علامت سکون ڈالنا یا نہ ڈالنا۔ اس اختلاف کا اثر کلمات " یومنون " ، " یوقنون " اور " ینفقون " کے ضبط میں نمایاں ہو گا۔

(۴) یای ساکنہ ماقبل مکسور پر علامت سکون ڈالنا یا نہ ڈالنا اور اس کے ماقبل پر کسرہ (ـِ) یا علامت اشباع (ـٖ) یعنی کھڑی زیر ڈالنا۔ اس اختلاف کا اثر " الذین " اور " یقیمون " کے ضبط پر پڑے گا۔

(۵) محذوف الف کو ظاہر کرنے کی علامتِ ضبط کا فرق (ـٰ یا ـٰ) اس کا اثر کلمات " الصلوٰۃ " اور " رزقنٰهم " کے ضبط میں ظاہر ہو گا۔

(۶) الف ساکنہ کے ماقبل (مفتوح) پر فتحہ (ـَ) یا علامتِ اشباع (ـٰ) یعنی کھڑی زبر ڈالنا۔ اس کا اثر کلمہ " مِمّا " کے ضبط میں ظاہر ہو گا۔

(۷) نون مخفاۃ (نون ساکنہ جس کے بعد کوئی حرف اخفاء آ رہا ہے) پر علامت سکون ڈالنا

یا نہ ڈالنا۔ عرب اور افریقی ملکوں میں نون مُخفاۃ کو علامتِ سکون سے خالی رکھا جاتا ہے۔ مصحف حلبی اور تجویدی قرآن میں اس کے لئے ایک خاص علامتِ سکون وضع کی گئی ہے۔ اس کا اثر " ینفقون " کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

(۸) راءِ مفخمہ کو بصورت " ر " لکھنا اور قلقلہ کے لئے خاص قسم کی علامتِ سکون (۸) کا اہتمام صرف تجویدی قرآن میں کیا گیا ہے۔ اس کی مثال " رزقنھم " ہے۔

(۹) افریقی ممالک میں نون متطرفہ پر علامتِ اعجام نہ ڈالنا یا اس کی جگہ کا اختلاف نیز افریقی ممالک میں " ف " کو " ڢ " اور " ق " کو " ڧ " لکھنے کا فرق۔ اس کا نمونہ آپ کلمات " الذین " ، " رزقنھم " ، یقیمون اور ینفقون " کے ضبط میں دیکھیں گے۔

اس طرح مجموعی طور پر آیت زیرِ مطالعہ کے کلمات میں اختلافِ ضبط کی مندرجہ ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں :-

اَلَّذِیۡنَ　　اَلَّذِیۡنَ　　اَلَّذِیۡنَ　　اَلَّذِیۡنَ　　اَلَّذِیۡنَ

یُؤۡمِنُوۡنَ　　یُؤۡمِنُوۡنَ　　یُؤۡمِنُوۡنَ　　یُومِنُونَ

بِالۡغَیۡبِ　　بِالۡغَیۡبِ　　بِالۡغَیۡبِ　　بِالۡغَیۡبِ

وَیُقِیۡمُوۡنَ　　یُقِیۡمُوۡنَ　　یُقِیۡمُوۡنَ　　یُقِیمُونَ

الصَّلٰوۃَ　　اَلصَّلٰوۃَ　　اَلصَّلٰوۃَ

وَمِمَّا　　مِمَّا ——　　رَزَقۡنٰھُمۡ　　رَزَقۡنٰھُمۡ　　رَزَقۡنٰھُمۡ

یُنۡفِقُوۡنَ　　یُنۡفِقُوۡنَ　　یُنۡبِفُونَ

★★★

ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۲)

ڈاکٹر محمد مقصود

اسلام کا سیاسی نظام

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بالفعل جو سیاسی نظام قائم کیا اُس کا اصل الاصول یہ تھا کہ سیاسی سطح پر فوقیت اور فیصلہ کن طاقت صرف اور صرف ایک ہی ہستی کو زیب دیتی ہے۔ جس کو خدا یا ذاتِ بے ہمتا کہتے ہیں جیسا کہ بقول اقبال

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اسی حقیقتِ کبریٰ کا اعلان و اظہار قرآن اپنے اوراق میں بارہا بڑے زور و شور اور طمطنے سے کرتا ہے کہ

۱۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ۔ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (یوسف: آیت ۴۰)

ترجمہ "حکم اللہ کے سوا اور کسی کا نہیں چلتا۔ اس کا مطالبہ اور فرمان ہے کہ اُس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو یہی صحیح دین ہے۔"

۲۔ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف: آیت ۵۴)

ترجمہ: "خبردار! خلق بھی اُسی کی ہے اور حکومت بھی اُسی کی۔"

۳۔ یَقُوْلُوْنَ ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ (آل عمران: آیت ۱۵۴)

ترجمہ: "وہ لوگ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے۔ کہو اختیار کل کا کل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

۴۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ ھٰذَا حَلٰلٌ وَّھٰذَا حَرَامٌ (النحل: آیت ۱۱۶)